مسلم ممالک، جمہوری روایت اور اسلام

انیس احمد

مسلم ممالک بالخصوص عرب دنیا میں جمہوری روایت کے نشو ونما و ارتقاء پر بات کرتے وقت مغربی تجزیہ نگار عموماً اپنے تحفظات کا ذکر کرتے ہیں اور بادشاہت یا فوجی آمریت کو جمہوریت کے لیے خطرہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق اس وقت دنیا کی ۱۸۹ اقوام میں سے تقریباً ۱۲۰ میں جمہوریت کسی نہ کسی شکل میں پائی جاتی ہے اور اس میں سے حد سے حد نصف مقامات پر جمہوری روایت مستحکم ہے۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں تقریباً ایک درجن ممالک میں جمہوریت کو صدمہ پہنچا اس سلسلے کی آخری مثال ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو ہونے والا پاکستان کا پرامن فوجی انقلاب تھا۔

ان ممالک میں جمہوریت کی ناکامی کے اسباب متنوع اور پیچیدہ ہیں۔ ان میں خصوصاً انصاف اور قانون کی حکمرانی اور تحفظ کا فقدان اور عدلیہ کا خودمختار نہ ہونا ایک بنیادی سبب کہا جاتا ہے۔ معاشی عدم استحکام اور قرضوں پر مبنی معاشی ترقی بھی ایک بنیادی سبب بتائی جاتی ہے، جس میں سیاست دانوں اور نااہل نوکر شاہی کی طرف سے مالی بددیانتی اور فنی قابلیت میں کمی کا بھی بڑا دخل سمجھا جاتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ترقی پذیر ممالک میں تقریباً ۴۰ فیصد قومی معاشی پیداوار صرف قرضوں کے سود کی ادائیگی پر صرف ہو جاتی ہے جبکہ قرضے وہیں کے وہیں رہتے ہیں۔ اس طرح معاشی اضمحلال کا ایک کبھی ختم نہ ہونے والا سلسلہ ان ممالک کو اپنی گرفت میں لیے رہتا ہے۔ اس میں رہی سہی کسر سیاست دانوں اور نوکر شاہی کی مالی بدعنوانی پورا کر دیتی ہے۔ ایسے معاشی حالات میں جمہوریت کو جس کی روح احتساب اور جواب دہی کے تصور میں ہے، کس طرح پنپنے کا موقع مل سکتا ہے۔ گویا نوکر شاہی ہو یا اختیارات پر قابض سیاست دانوں یا فوج کا گروہ، ہر ایک جمہوریت کے موضوع پر اپنی گل افشانی کے باوجود حقیقی جمہوریت کے لیے ہمیشہ سنگ راہ بنا رہتا ہے۔

یہ فطری بات ہے کہ عدل و انصاف کا فقدان، تحفظ کا نہ ہونا، حکمرانوں کی بے اصولی اور مالی استحصال کا آنکھوں کے سامنے پایا جانا، نظم مملکت پر سے لوگوں کے اعتماد کو متزلزل کر دیتا ہے اور Crisis of Governance کے گہرے سے گہرا تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ انتظامیہ اور سیاست دان ایسی بگڑی ہوئی صورت حال میں اپنی نااہلی اور جرائم پر پردہ ڈالنے اور عوام کی توجہ اصل مسئلہ سے ہٹانے کے لیے ایسے قضیوں کو ہوا دیتے ہیں جن میں الجھ کر عوامی توجہ بدعنوان حکمرانوں کی طرف سے ہٹ جائے۔ اس حوالہ سے سب سے زیادہ کارگر حیلہ مذہبی تفرقہ بازی ہے۔ چنانچہ اکثر عرب حکومتوں نے اپنی ضرورت کے پیش نظر کبھی اسلامی تحریکات کو قید و بند اور ظلم کا نشانہ بنایا اور کبھی انہیں وقتی آزادی دے کر دوسرے نظریاتی دشمنوں کی قوت کو توڑنے یا اپنے حق میں ایک توازن پیدا کر کے ان تحریکات پر قابو پانے کے لیے استعمال کیا۔

پاکستان میں بھی صورت حال اس سے مختلف نہیں رہی۔ دو بڑی سیاسی جماعتیں باری باری ملک اور عوام کو اپنی سواری کے لیے استعمال کرتی رہیں، خود مسلکی جماعتوں نے خواہ وہ دیوبندی مکتب فکر کے علمبردار ہوں یا بریلوی، اہل حدیث یا شیعہ مسلک سے تعلق رکھتے ہوں، کبھی اپنے آپ کو ایک پارٹی سے وابستہ کیا کبھی دوسری سے اور اپنی سیاسی پشت پناہی کے بل پر اپنی مخالف مسلکی جماعت کے افراد کو زک پہنچانے میں کبھی تکلف نہیں کیا۔ لیکن ایک پرانی کہاوت کے مصداق ''کرے مونچھوں والا پکڑا جائے ڈاڑھی والا'' مذہبی تشدد کا الزام بلا استثناء مسلکی جماعتوں پر ہی رکھا گیا۔ دوسری جانب ان میں سے کئی جماعتوں نے خود بھی اپنی قوت بازو کا اظہار کرنے کے لیے اپنی ذیلی نیم عسکری تنظیمیں قائم کر کے اس الزام کے لیے خود بنیاد فراہم کر دی۔

ان زمینی حقائق کے پیش نظر اور بالخصوص مذہبی تشدد پسندی اور فرقہ وارانہ قتل و غارت کے حوالے سے مغربی مصنفین کے اعتراضات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس صورت حال کے اسباب پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ بالخصوص یہ کہ (i) کیا نام نہاد ترقی پذیر ممالک (عرب دنیا میں یا ایشیائی ممالک) میں مذہبی منافرت اور تشدد پسندی کے باوجود جمہوریت کا کوئی مستقبل ہے؟ (ii) کیا جمہوریت واقعی اسلام کی ضد ہے؟ اور (iii) کیا تحریکات اسلامی ان بگڑے ہوئے حالات میں اسلامی نظام حکومت کو بطور متبادل نافذ کرنے کی قوت رکھتی ہیں؟

مغربی مصنفین ان تینوں سوالات کا جواب عموماً نفی میں دیتے ہیں یعنی جمہوریت اور اسلامی احیائی تحریکات میں نبھاؤ بہت مشکل ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اسلامی تحریکات ''جہاد'' پر ایمان رکھنے کے سبب تشدد کو جائز سمجھتی ہیں اس لیے ایک معتدل (modrate) اور آزادی پسند (liberal) نظام اور ماحول پیدا کرنے سے قاصر ہیں اور نتیجتاً جہاں کہیں بھی اسلامی نظام کے نفاذ کا امکان پیدا ہوتا ہے اسے قصر جمہوریت اور سرمایہ دارانہ نظام کے لیے شدید خطرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس طرح deductive logic یا منطق استخراجیہ میں ایک مفروضہ دوسرے مفروضے سے ملحق ہوتا ہے اور ایک متوقع منطقی نتیجہ کی طرف لے جاتا ہے، بالکل اسی طرح یہ تصورات مغربی ابلاغ عامہ اور علمی حلقوں میں متواتر پیش کیے جا رہے ہیں، جن کا اظہار عمانویل سیوان (Emmanuel Sivan) نے اپنے مضمون (Arabs & Democracy: Illusions of Change) میں واضح طور پر کیا ہے۔

ہمارے خیال میں اپنی تمام تر معروضیت کے باوجود مغربی مصنفین اسلام اور جمہوریت کے بنیادی تضاد، تحریکات اسلامی کے انتہا پسند اور جہاد کے ''مذہبی جنون'' ہونے کے بارے میں اپنے طے شدہ تصورات اور ذہنی تحفظات کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ ساون کے اندھے کی طرح انہیں ہر چیز ہری ہری نظر آتی ہے۔ کوسوشل سائنس کی تحقیق حکمت عملی (Research Methodology) میں نام نہاد معروضیت کے باوجود داخلیت کے عنصر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن یہاں معاملہ اس سے کچھ بڑھ کر ہے۔

مندرجہ بالا تینوں فکری انحراف کی اصلاح تفصیلی گفتگو کی متقاضی ہے۔ ہم انتہائی اختصار سے یہاں صرف تین نکات کی طرف اشارہ کریں گے:

1۔ اسلام اور جمہوریت بلاشبہ بنیادی طور پر دو مختلف چیزیں ہیں۔ اسلام کی بنیاد قرآن و سنت کی عظمت اور مطلق بالادستی پر ہے جبکہ جمہوریت نظری طور پر عوام کی بالادستی کا نام ہے۔ اس بنیادی فرق کے ساتھ اسلامی نظم مملکت کی بنیاد شوریٰ کے الہامی اصول پر ہے اور اسلامی نظام خلافت فرد یا طبقہ علماء کی آمریت سے مکمل طور پر آزاد ہے۔ مغرب کے ذہن میں لفظ مذہب جو ارتعاش پیدا کرتا ہے اس کی ہر لہر سے تھیاکریسی (Theocracy) کی صدا بلند ہوتی ہے۔ پھر بعض حادثات زمانہ بھی مغرب کے اس تصور کی کسی حد تک تائید کر دیتے ہیں مثلاً فی زمانہ ''طالبان'' کا ذہنی ہوا جسے مذہبی ریاست کے ماڈل کے طور

پر پیش کیا جاتا ہے۔ خود پاکستان کے لادینی فکر رکھنے والے دانشور ہر دو دن کے بعد انگریزی کے کسی روزنامہ میں کسی مضمون یا ادارتی نوٹ کے ذریعہ اس خطرہ کی گھنٹی بجاتے رہتے ہیں کہ ''طالبان دستک دے رہے ہیں!'' اور اس طرح ''مذہبی جنونیت کے غبارے'' میں روز ہوا بھرتے رہتے ہیں تا آنکہ عوام الناس کے ذہن میں مذہبی عناصر کے لیے سوائے نفرت کے کوئی جذبہ باقی نہ رہے۔

اسلام روح جمہوریت کا علمبردار لیکن انسان کی خدائی کا منکر ہے۔ وہ انسان کو ایک باشعور، آزاد، فیصلہ کرنے والی مخلوق کی حیثیت سے ارادہ کی آزادی دیتے ہوئے سیاسی، معاشی اور معاشرتی معاملات میں اپنی قوت فیصلہ کے صحیح استعمال کی دعوت دیتا ہے لیکن ساتھ ہی ہر قدم پر انسان کو یاد دلاتا رہتا ہے کہ نہ وہ اقتدار کا بندہ ہے نہ عوام کا بلکہ وہ صرف اللہ کا بندہ ہے۔ جب تک اس بنیادی حقیقت کو ذہن نشین نہ کر لیا جائے خیالات اور تصورات کا تاج محل بنیادی پتھر کے ٹیڑھے ہونے کے سبب تاثر یا کجی اور ٹیڑھ سے خالی نہیں ہو سکتا۔

II۔ مسلم ممالک خصوصاً عرب دنیا میں ملوکیت، فوجی آمریت یا غیر جمہوری نظاموں کے پائے جانے کے اصل سبب پر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ایک جانب خلافت راشدہ کے بعد خاندانی اور شخصی ملوکیت کے دور کا آغاز ہوا اور تھوڑے عرصہ بعد مسلمانوں کے سیاسی اور تہذیبی زوال کے ساتھ ہمسایہ تہذیبوں کے زیر اثر بادشاہت کے نظام کی مختلف شکلوں نے رواج کی شکل اختیار کر لی۔ دوسری طرف اٹھارہویں صدی سے مغربی سامراج نے مسلم ممالک میں جہاں جہاں قدم جمائے بادشاہوں اور آمروں کو اپنے حق میں بہتر جانا اور اپنے جمہوریت کے عشق کے دعووں کے باوجود اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے آمروں اور جابروں کی حمایت و طرف داری کی۔ دور جدید میں مغربی فکر اور حکمت عملی کا ایک واضح تضاد مغربی طاقتوں کی خارجہ، معاشی، اور ابلاغ عامہ کی پالیسی میں واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ عرب دنیا کی بادشاہتوں اور سابق شاہ ایران اور شمالی افریقہ کی آمریتوں کو تحریکات اسلامی نے نہیں جمہوریت کے مدعی مغرب نے پروان چڑھایا، کھل کر ان کی مکمل حمایت و امداد کی اور ان ممالک کی اسلامی تحریکات کو ان کی جمہوریت پسندی کے باوجود اپنا دشمن سمجھا۔

III۔ اکثر تحریکات اسلامی نے اپنے سیاسی پروگرام اور منشور میں جن باتوں کو اولین اہمیت دی ہم

ذیل میں صرف نکات کی شکل میں ان کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہ نکات خود ان تحریکات کے بارے میں مغرب کی غلط فہمی کی اصلاح کے لیے کافی مواد فراہم کرتے ہیں۔ اور تاریخی اور دستاویزی طور پر ان تحریکات کے ''مذہبی جنونی''، ''انتہا پسند'' یا ''جمہوریت دشمن'' ہونے کی مکمل تردید کر دیتے ہیں۔ پاکستان، سوڈان، ترکی اور اردن کی تحریکات اسلامی یقین رکھتی ہیں کہ:

۱۔ ملک میں اسلامی نظام کے قیام کی راہ کے لیے دستوری اور جمہوری جدوجہد ہی صحیح طریقہ انتخاب ہے۔

۲۔ ملک و قوم کی اصلاح تعلیمی، دعوتی، فلاحی اور سیاسی حکمت عملی کے بغیر نہیں ہو سکتی ہے اس لیے تبدیلی و اصلاح کے لیے ایک طویل سفر صبر و استقامت کے ساتھ طے کرنا ہوگا۔

۳۔ ایک صالح اور عادلانہ نظام کا قیام صالح اور آزاد قیادت کے بغیر ممکن نہیں۔ وہ فرمانروا طبقہ جو بیرونی طاقتوں کی خواہشات کا غلام ہو اور ان کے اشاروں پر ناچنے کے لیے ہر وقت آمادہ رہتا ہو وہ محب وطن قیادت فراہم نہیں کر سکتا اس لیے صالح افراد کی تیاری اور ان کی تنظیم و تربیت ایک عادلانہ نظام کا پیش خیمہ ہے۔

۴۔ good governance یا **حسن انتظام** کے لیے اسلام کے دیے ہوئے ضابطہ اخلاق کی پیروی لازمی ہوگی اور ایسے افراد کا بے لاگ احتساب ضروری ہوگا جو ملک و قوم کے استحصال پر پلے اور بڑھے ہوں۔

۵۔ قانون کا احترام اور بالادستی قائم کرنے کے لیے عدلیہ کو سیاسی اور حکومتی اثرات سے پاک کرنا ہوگا اور اہلکاروں کو باوقار اور باعزت طور پر زندگی گزارنے کے لیے مناسب اعزازیہ کے ساتھ احتساب کی چھلنی سے گزرنا ہوگا تاکہ صرف وہ حضرات مناصب پر ہوں جن کا دامن خود داغدار نہ ہو۔

۶۔ اہلکاروں کے انتخاب میں صرف اور صرف صلاحیت کو بنیاد بنانا ہوگا، سفارش، اقربا پروری اور صوبہ پروری کا کلچر یکسر ختم کرنا ہوگا۔

۷۔ اقتصادی خود مختاری کے لیے سودی کاروبار کو ختم کر کے اسلامی اصولوں پر معیشت کو استوار کرنا ہوگا۔

۸۔ سیاسی جماعتوں کے لیے بھی ضابطہ اخلاق کی پابندی لازمی ہوگی اور کم از کم انہیں خود جمہوری اصولوں پر عمل کرنا ہوگا۔ موروثی سیاست (کہ باپ کے بعد بیٹی یا بیٹا یا بیوی سیاسی جماعت کی قیادت پر قابض ہو جائے) کا خاتمہ کرنا ہوگا۔

۹۔ مسلکی تشدد اور منافرت کی جگہ رواداری، اور باہمی احترام کو جگہ دینی ہوگی۔

۱۰۔ نظام تعلیم میں بنیادی تبدیلی کے ذریعے سیکولر ذہن کی جگہ ایک دین سے محبت کرنے والا، انسانی جان و مال، عزت اور اختلافات کا احترام کرنے والا انسان وجود میں لانا ہوگا۔

ان نکات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا بھر میں اسلامی تحریکات نے نہ تو کبھی حصولِ اقتدار کے لیے تشدد کا راستہ اپنایا ہے اور نہ ہی ہلہ بول کر نظام اسلام کے نفاذ کی قائل ہیں۔ بلکہ اس کے برعکس صبر و استقامت اور دستوری ذرائع سے اصلاح اور قیام عدل کے لیے کوشاں ہیں۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تحریکات اسلامی کے مغربی نقاد یا تو ان تحریکات کے دساتیر، منشور اور اصلاح و تجدید کے تصورات سے براہ راست واقفیت نہیں رکھتے اور ثانوی ذرائع معلومات پر انحصار کرتے ہوئے ان کے بارے میں ایک ذہنی تصویر بنا لیتے ہیں یا تحریکات اسلامی نے خود اپنے بارے میں معلومات فراہم کرنے اور ایک تہذیبی اور فکری مکالمے کے ذریعہ دوسروں کو اپنے مقاصد اور طریق کار سے آگاہ کرنے میں غفلت برتی ہے۔ مسئلہ کا حل نہ الزام تراشی ہے نہ ایک دوسرے کو نظر انداز کرنا۔ تحریکات اسلامی کے بارے میں گمراہ کن تصورات کی اصلاح اگر مغرب کی ضرورت نہ بھی ہو جب بھی تحریکات اسلامی کو اپنے دعوتی اور اصلاحی تشخص کی بنا پر خود آگے بڑھ کر ایک ثقافتی اور علمی مکالمے کا آغاز کرنا ہوگا جو آخر کار خود اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں مغرب کے ناقص اندازوں کی اصلاح میں مددگار ہوگا۔